Al-Qalam القلم
p-ISSN: 2071-8683, e-ISSN: 2707-0077
Volume:26, Issue:1, 2021; pp. 198-213

پاکستانی خواتین کی افسانہ نگاری: مذہبی اور سیاسی شدت پسندی کے تناظر

Pakistani Women's Fiction: Perspectives on Religious and Political Extremism

Shazia Andalib *(corresponding author)*
PhD, Urdu Scholar, GC Women's University, Faisalabad
Email: scholargcwuf@hotmail.com

Dr. Sadaf Naqvi
President of the Department of Urdu / Assistant Professor
GC Women's University, Faisalabad

KEYWORDS:

ISLAM, RELIGIOUS, HATRED, TERRORISM, INVASION, NEW WORLD ORDER, FICTION

Date of Publication:
26-06-2021

ABSTRACT

Islam is the religion of securi ''New World Order'' of the world powers linked Islam to religious hatred and terrorism, which severely affected Pakistani society. The last three decades of the 20th century and these two decades of the 21st century are tainted with the innocent blood of Muslims. 21st century Pakistani Women Fiction Writers Report on United State of America invasion of Afghanistan and write on terrorism to much. Prominent names of female fiction writer are Zahida Hina, Nelo Far Iqbal and Altaf Fatima.

کلیدی الفاظ: اسلام، مذہبی منافرت، دہشت گردی، عالمی منظر نامہ، استعمار، نیو ورلڈ آرڈر۔

تمہید:

اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ لیکن عالمی طاقتوں نے اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کے لئے اسلام کا رشتہ دہشت گردی اور منافرت سے جوڑ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی مفاد کے تحت پاکستان میں دہشت گردی کو فروغ دیا گیا۔ بیسویں صدی کی آخری تین دہائیاں اور اکیسویں کی ان دو دہائیوں میں پاکستان میں مذہبی منافرت اور دہشت گردی عروج پر رہی۔ پاکستان میں اسی اور نوے کی دہائی میں سیاسی و سماجی صورتِ حال مخدوش رہی جس کی وجہ سے عوام پریشانی میں مبتلا رہے۔ نوے کی دہائی میں جب مارشل لاء کے سیاہ بادل چھٹ گئے تو ایک پُر امن ماحول پیدا ہونے لگا لیکن عوامی نمائندوں اور فوج کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی کا کھیل بند نہ ہوا یہاں تک کہ پرویز مشرف کا مارشل لاء ملک میں نافذ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی گیارہ ستمبر کے واقعے نے پاکستانی معاشرے کو مذہبی فرقہ واریت اور تخریب کاری کی طرف دھکیل دیا۔ امریکہ کا ساتھ دینے پر تحریک طالبان اور القاعدہ نے پاکستان کا امنِ عامہ برباد کر دیا اور ہر جگہ دہشت گردی کے واقعات رونما ہونے لگے۔ اس سے قبل شیعہ سنّی فسادات تو کھلے عام ہوتے رہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اب بلوچستان میں علیحدگی کی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور اکبر بگٹی کے قتل نے بلوچستان کو پاکستانی فوج اور پنجابیوں کے لیے قبرستان بنا کر رکھ دیا یہاں تک کہ امن کی بحال میں دو عشرے لگ گئے۔ پاکستان میں اندرونی دہشت گردی کی وجہ سے عوام کا بے پناہ جانی و مالی نقصان ہوا۔ مشرف دور میں دہشت گردی کی جو لہر چلی تھی، اس نے ایک دہائی سے زیادہ تک تھمنے کا نام نہیں لیا۔ سوات اور چترال کے علاقوں میں دہشت گردوں نے محفوظ پناہ گاہیں بنالیں اور وہاں کی آبادی کو اپنی ازلی دقیانوسیت اور شدت پسندی کے شکنجوں میں جکڑ کر اپنے مذموم مقاصد پورے کرنے لگے۔ ادھر افغانستان پر امریکی حملے کے نتیجے میں جو بے گناہ مسلمانوں کا خون ارزاں ہوا تو اس ایسے پر بھی افسانہ نگار چپ نہیں بیٹھے بلکہ انہوں نے تاریخ کے اوراق میں چھپی اُس وحشت و دہشت اور شہنشاہوں کی من مانیوں کو اپنے اپنے عہد سے نکال کر ایک رویہ اور سوچ میں یکجا کیا جس کا شکار یہ پسماندہ و غریب خطے روز ازل سے رہے ہیں۔ ہر اچھی چیز پر قبضہ کر لینا استعماریت کی اس ناجائز اولاد کا پرانا وطیرہ ہے۔ امریکہ کے افغانستان پر حملے کے پس منظر میں سب سے زیادہ پاکستان متاثر ہوا اور اس سلسلے میں امریکہ کا اتحادی بن کر طالبان کی مخالفت مول لی جس کے نتیجے میں پاکستان کے طول عرض میں دہشت گردی کی نئی لہر

پھیل گئی۔ بہر کیف اس سب کے باوجود پاکستانی خواتین افسانہ نگاروں نے افغانستان پر امریکی دہشت گردی کے خلاف بہت کچھ لکھا جن میں زاہدہ حنا کا نام پیش پیش ہے۔ افغانستان میں امریکی جارحیت کے حوالے سے طاہرہ اقبال لکھتی ہیں: "امریکی جنگی جنون نے افغانستان کو تہس نہس کر دیا ہے۔ ان کھنڈرات سے طالبان پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ زمین جو بارود کی کثرت سے فصل اگانے کے قابل نہیں رہی لیکن سروں کی فصل کٹانے کو طالبان دھڑا دھڑا پیدا ہو رہے ہیں جن کا پروردہ جذبہ انتقامی غیظ و غضب ہے۔۔۔ آج بھی تاریخ اس سوال پر مجرم بنی کھڑی ہے کہ وہ لاکھوں معصوم بچے، لڑکیاں اور نوجوان جو بارودی بارش میں نہلا دیے گئے اور بارودی سرنگوں میں چُن دیے گئے، اُن کا قصور کیا تھا؟ تاریخ چاہے مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کرے لیکن ادیب پر ایک کڑی ذمہ داری آپڑی ہے کہ اسے عصر کی پکار کو سننا ہوتا ہے۔"[1]

اکیسویں صدی کا آغاز جب ہوا تو پوری دنیا نے خوشحالی اور عالم گیر امن کے قیام کے خواب اپنے ذہنوں میں سماتے ہوئے اس نئی صدی کا استقبال کیا لیکن یہ خواب فقط خواب ہی رہ گیا امریکا کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر ۱۱/ ۹ کو ہونے والے حادثے نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس دن کے بعد سے نیو ورلڈ آرڈر کا ایجنڈا اپنے نفاذ کی طرف بڑھتا گیا۔ گیارہ ستمبر کا دن عہد جدید کی تاریخ کا اہم ترین دن ہے جب پرانی تہذیبی اقدار کا خاتمہ ہوا اور مشرق و مغرب کے مابین ایک نیا رشتہ استوار ہوا۔ اس رشتے کو غیر اسلامی ممالک خصوصاً امریکا نے مسلم ممالک سے منافقانہ اور باغیانہ رویہ اختیار کیا۔ گیارہ ستمبر امریکا کا رچایا گیا محض ایک ڈراما تھا جس کی آڑ میں اسے مسلمانوں پر دہشت گردی کا لیبل لگا کر مسلم دنیا پر چڑھ دوڑنے کا کوئی معقول جواز چاہیے تھا اور اس کا انتظام اس نے اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار کر کر لیا۔ گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ محض ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ دنیا کی تاریخ کا ایک ایسا موڑ ہے جہاں سے نئے عالمی نظام اور دھڑے بندیوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ عسکری تحریک سے فکری رویوں میں بدلنے والا واقعہ ہے جس نے دنیا کی تمام زبانوں کے ادب کو متاثر کیا۔ اس کے اثرات صرف اردو ادب پر ہی نہیں بلکہ عالمی ادب پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔ عربی ادب میں بھی اس کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سٹر کچرالزم، پوسٹ سٹر کچرالزم، پوسٹ کولونیل ازم، پوسٹ مارکسزم اور پوسٹ فیمینزم سے بھی مابعد کی دنیا ہے جہاں دنیا کے تمام مسلمانوں اور بالخصوص مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے خلاف تعصب اور نفرت کے بیج بوئے گئے۔

اسی کو ایک خاص قسم کے بیانیے میں ڈھال کر پہلے عراق کے قدرتی وسائل کی دولت لوٹی گئی اور اس کے بعد اگلی ترجیح افغانستان ٹھہرا۔ ۲۰۰۳ء میں امریکہ نے عراق کے صدر صدام حسین پر دہشت گردی اور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار بالخصوص (WMDs) کے ڈھیر اکٹھا کرنے کے الزامات لگائے اور اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی گزارشات کو پس پشت ڈالتے ہوئے عراق پر پیشگی حملہ کر دیا۔ یہ دونوں الزامات درست ثابت نہیں ہوئے۔ بہر حال فلوجہ اور نجف کے ہفتوں بھر محاصرہ اور بمباری، ابو الغریب جیل میں جنگی قیدیوں پر جسمانی تشدد اور ان کی جنسی تذلیل کے علاوہ اس جنگ کے نتیجے میں ایک لاکھ سے زائد عراقی باشندے اور ڈیڑھ ہزار سے زائد امریکی فوجی ہلاک ہوئے۔ مالی نقصان کا اندازہ تین سو بلین ڈالر لگایا جاتا ہے۔ گیارہ ستمبر کے واقعے نے پوری دنیا کے ادیبوں کو متحرک کر دیا اور ہر زبان میں کہانیاں لکھی گئیں۔ پاکستانی اردو ادب بھی اس کے عالم گیر اثرات سے بچ نہ سکا۔ اسی حوالے سے نجیبہ عارف لکھتی ہیں: "اس پس منظر میں گیارہ ستمبر کا واقعہ جو اگرچہ پاکستان سے کوسوں دور کسی اجنبی سر زمین پر نمودار ہوا مگر اپنے ہمہ گیر اثرات اور پاکستان کی مخصوص سیاسی و دفاعی نوعیت اور جغرافیائی حیثیت کے پیشِ نظر، پاکستان کی سیاست، معیشت، معاشرت اور شہری زندگی کے امن و سکون پر شدت سے اور منفی طور پر اثر انداز ہوا۔ اردو فکشن اور شاعری پر دونوں میں بھرپور طریقے سے رونما ہوا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پاکستان میں واقع نہیں تھا اور ان پر حملہ کرنے والے ملزموں میں سے کوئی بھی پاکستانی ثابت نہیں ہوا۔ ۲۲ جولائی ۲۰۰۴ء کو امریکہ کی نیشنل کمیشن کی جاری کردہ رپورٹ کے مطابق ۱۹ میں سے ۱۵ ہائی جیکروں کا تعلق سعودی عرب سے، دو کا متحدہ عرب امارات سے اور ایک کا لبنان سے تھا جبکہ گروہ کا سرغنہ محمد عطا مصری تھا۔ لیکن اس کو باوجود پاکستان کو اس کا خراج دینا پڑا اور اس حملے کے نتائج سے براہِ راست متاثر ہونا پڑا۔ اسی کے نتیجے میں پاکستان کے پڑوسی ملک افغانستان پر وحشیانہ بمباری ہوئی جس کا شدید ردِ عمل پاکستان کے مذہبی حلقوں میں پیدا ہوا۔"(۲)

امریکہ نے ایک جواز پیدا کر کے افغانستان کی سر زمین پر بے گناہ لوگوں کا خون بہایا تو پوری امتِ مسلمہ میں امریکہ کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ شعرا نے نظمیں لکھیں اور افسانہ نگاروں نے ان موضوعات پر افسانے لکھے۔ ادھر پاکستان میں صورت حال مختلف تھی کیونکہ طالبان کے خلاف امریکہ کا اتحادی بننے پر پاکستان میں دہشت گردی کی لہر دوڑ گئی اور معصوم لوگوں کو خاک و خون میں تڑپا دیا جس کو پاکستانی اردو افسانہ نگاروں نے

اپنی کہانیوں میں بیان کیا۔ پاکستان کے طول و عرض میں جہادی نرسریاں موجود تھیں اور حسبِ معمول ان مذہبی فیکٹریوں سے شدت پسند مکتبہ فکر کے لوگ پیدا کیے جاتے تھے جو پاکستان میں دہشت گردی پھیلانے کا سبب بنے۔ افسانہ نگاروں نے حالات و واقعات کے ردِ عمل کے اظہار میں کہانیاں لکھیں اور پاکستانی اردو افسانہ نگاروں نے قوم کے اس کرب کو موضوع بنایا جو دہشت گردی اور بہیمانہ ظلم و تشدد کا نشانہ بنائی جارہی تھی۔ پاکستانی خواتین افسانہ نگاروں میں سے اس سلسلے میں نیلوفر اقبال کا نام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جنھوں نے بڑی بیدار مغزی کا ثبوت دیتے ہوئے دہشت گردی اور مذہبی منافرت پر مبنی تعصبات کو موضوع بنایا اور دہشت گردی سے پیدا ہونے والے مسائل سے جو لوگ متاثر ہوئی اُن لوگوں کی اَن کہی کہانیوں کو بڑے المناک انداز میں پیش کیا۔ ان کے افسانے "اوپریشن مائیس" اور "سرخ دھبے" ایسے ہی افسانوں کی مثالیں ہیں، جن میں امریکی جارحیت و انتقام کی آگ میں سلگنے والے بے گناہ مسلمانوں کی ان کہی داستان کو بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح دیگر پاکستانی افسانہ نگاروں نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ ان قابلِ ذکر افسانوں کی فہرست میں "شناخت"(مسعود مفتی)، "دیدو ادید"(الطاف فاطمہ)، "ایکسائنگلوسٹائل وصیت نامہ"(محمد منشایاد)، "ابن آدم"(خالدہ حسین)، "مجال خواب"(رشید امجد)، "عجائب گھر"(مصطفی کریم)، "اوپریشن مائس" اور "سرخ دھبے"(نیلوفر اقبال)، "دام وحشت"(مبین مرزا)، "کارگر"(فاروق خالد)، "رئیلٹی شو"(عرفان احمد عرفی)، "نیند کا زرد لباس"(زاہدہ حنا)، "اینڈ آف ٹائم"(پروین عاطف)، "پردیسی"(افتخار نسیم) "سورگ میں سورگ"(محمد حمید شاہد)، "یہ جنگل کٹنے والا ہے"(انوری زاہدی)، "بلقان کا بت"(عطیہ سید)، "چودھویں رات کی سرچ لائٹ"(فرخ ندیم)، "مہاجر پرندے"(پرویز انجم) "سرخ" (مسعود صابر)، "لاوقت میں ایک منجمد ساعت"(عاطف سلیم)، "دہشت گرد چھٹی پر ہیں"(علی حیدر ملک) اور "بن کے رہے گا"(آصف فرخی) وغیرہ جیسے افسانے شامل ہیں جن کو بڑی شہرت ملی۔ ان افسانوں میں پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی، مذہبی فرقہ واریت، لسانی تنازعات اور بلوچستان میں بی۔ ایل۔ اے اور بی۔ ایل۔ آر جیسی علیحدگی کی تحریکوں کے بہیمانہ ظلم کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اکیسویں صدی کی پاکستانی خواتین افسانہ نگاروں نے نائن الیون یا گیارہ ستمبر کے بعد سب سے پہلے عراق میں امریکہ کی جاری دہشت گردی کے تناظر میں افسانے لکھے جن میں الطاف فاطمہ کا نام بہت سامنے کا ہے۔ الطاف فاطمہ کا افسانہ "دیدوادید" ایک عراقی عرب لڑکی کی ایسی کہانی ہے جس کے ملک پر معاشی پابندیوں کے بعد حملہ کر کے اس

کو تباہ و برباد کر دیا گیا ہے۔ اس افسانے کو علامتی افسانہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ الطاف فاطمہ نے فلیش بیک کی تکنیک کو بروئے کار لاتے ہوئے افسانے کی ابتدا کا دریچہ ہارون الرشید کے عہدِ حکومت میں جا کھولا ہے:"یہ بغداد ہے۔ ہارون الرشید کا بغداد، جہاں کبھی ہارون الرشید رات کے وقت بھیس بدل کر گلی محلوں کا گشت لگایا کرتا تھا اور اس کا وزیرِ اعظم اور دست راست جعفر برمکی اس کے ہمراہ ہوتا تھا۔ وہ عام شہری کی طرح کھلے بندوں گھوما پھرا کرتے تھے۔ ہر شام ایک نئے بھیس اور ایک مختلف روپ میں اپنے شہر کی گہما گہمی اور رونقوں میں بنفسِ نفیس خود شامل اور شریک ہوتے۔ کبھی دجلہ و فرات کے ساحلوں پر مچھیروں اور کشتی رانوں کے درمیان ان کے ہی انداز میں اٹھ بیٹھ کر ان کی باتوں اور ان کی زندگی کی الجھنوں سے آگاہی حاصل کرتے۔"(۳) اس افسانے میں الطاف فاطمہ نے فلیش بیک کی تکنیک اس طرح استعمال کی کہ افسانے کا لوکیل دو زمانی سطحوں پر مبنی ہو گیا ہے۔ ماضی کا اُموی خلیفہ ہارون الرشید ماضی کے جھروکوں سے جہاں جھانکتا ہے وہاں وہ حال کے بغداد میں لا کھڑا کیا جاتا ہے جہاں گیارہ سو سال گزر گئے چکے ہیں۔ لیکن یہ بغداد ایسا بغداد نہیں ہے کہ جہاں امریکیوں کی غنڈہ گردی کے تحت معاشی پابندیاں لگی ہوئی ہوں بلکہ کاروبارِ حیات اپنی پوری تندہی کے ساتھ چل رہا ہے:"بازاروں اور منڈیوں پر سینکشن نہیں لگے ہیں اور ہر قسم کا انفراسٹرکچر نہ ہونے کے باوجود اونٹوں کے قافلوں کی آمد و رفت مسلسل جاری ہے۔ قطار در قطار دیس دیس ولایت کا مال آ رہا ہے اور یہاں کا مال دساور کو جا رہا ہے۔"(۴)

افسانے کا متکلم ہارون الرشید ہے مگر یہ خلیفہ ہارون الرشید نہیں ہے جو کہ اصل میں افسانے کے آغاز میں ہی دکھایا گیا ہے۔ یہ ہارون الرشید بغداد میں رہنے والا ایک پاکستانی صحافی ہے۔ بغداد جو کبھی عروس البلاد تھا، کئی بار اجڑا اور سنورا لیکن اب کی بار بم بارود اس کی گلیوں میں اور کھیت کھلیانوں میں بچھائے گئے تھے جو کسی جانور کے پاؤں پڑ جانے پر بھی اس کے چیتھڑے اڑا سکتے تھے۔ یہ کردار تھوڑا ناسٹیلجیائی قسم کا ہے اور وہ عروس البلاد والے بغداد کی تخلیقی فضاؤں میں الف لیلوی شہر زاد کو دیکھتا ہے۔ یہ پاکستانی صحافی خیالی طور پر ہارون الرشید کے زمانے میں زندہ ہے اور الف لیلوی فضا والے بغداد کو دیکھتا ہے۔ اس کے سامنے جس شہر زاد کا کردار ہے وہ عراق میں رہنے والی حلیمہ ہے۔ یہ عراقی لڑکی امریکی حملے میں اپنا سب کچھ کھو چکی ہے۔ الطاف فاطمہ نے عراق پر امریکی حملے سے عرب عورتوں کے ساتھ کیے گئے بہیمانہ مظالم کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ حلیمہ کا کردار بھی ماضی کی طرف مراجعت کا احساس دلاتا ہے مگر لمحہ حال کا المیاتی کردار ہے جو پاکستان میں پڑھنے کے لیے آئی تھی اور ہارون الرشید

کی چچی کے ہاں پے انگ گیسٹ کے طور پر رہی تھی۔افسانہ نگار نے حلیمہ کے کردار کو طلسماتی فضا بنانے کے لیے شہر زاد کے تاریخی کردار سے تشبیہہ دی ہے۔پاکستانی صحافی کی زبان سے حلیمہ کے بارے میں جو تاثرات ادا کروائے جاتے ہیں،ان میں کہیں کہیں رومانویت کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے:"میں اس کو ایک لمحہ بھر حیرت سے دیکھتارہ گیا تھا۔تب میرے منھ سے حیرت واستعجاب کے عالم میں نکلا تھا" ارے شہر زاد تم یہاں؟" اور وہ بولی "کچھ ہوش میں ہو تم۔جہاں تک میرا اندازہ ہے، تم ہارون الرشید ہو۔ہاں وہی تو ہو جس سے میں پاکستان میں ملی تھی۔یاد ہے ان دنوں میں تم یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور میں تمھاری چچی کے یہاں بطور پے انگ گیسٹ رہتی تھی۔"میں آنکھیں پھاڑ کر اس کو دیکھتا تھا۔ایک زہر خند اس کے لبوں پر رقصاں ہوا اور بولی"تم اتنے حواس باختہ کیوں ہو؟ہارون الرشید!حواس باختہ تو مجھ کو ہونا چاہیے تھا۔ہاں حلیمہ واقعی حواس باختہ ہو رہا ہوں۔تم کو اور تمھارے شہر کی خرابی کو دیکھ کر میں کس طرح پہچان پاتا تم۔۔۔تم میں اور اس لڑکی حلیمہ میں کتنا فرق ہے۔"(۵)

ہارون الرشید اور حلیمہ کے درمیان خط وکتابت جاری رہتی ہے۔اس افسانے کا لوکیل بغداد بھی ہے اور لاہور بھی۔یوں افسانہ قومی سطح سے بلند ہو کر اکیسویں صدی میں دہشت گردی کے بین الاقوامی مسائل کا نمائندہ بن جاتا ہے اور عراق میں امریکہ کی ریاستی دہشت گردی کو ظاہر کرتا ہے۔حلیمہ پاکستان آتی ہے اور تھوڑے عرصے کے لیے ہارون الرشید کی چچی کے ہاں ٹھہرتی ہے۔یہاں ان دونوں کی ملاقات ہوتی ہے اور ہارون الرشید کو بغداد کی سنگین صورتحال کا علم ہوتا ہے۔بغداد میں جو کچھ امریکی کر رہے ہیں وہ نیو ورلڈ آرڈر کے عملی اطلاق کی پہلی شکل ہے جس میں ان کی اولین ترجیح مشرقِ وسطیٰ میں تیل سے مالامال مسلم ممالک کی دولت کو لوٹنا ہے۔بغداد پر امریکی یلغار،گلی سڑی ہوئی لاشوں کے انبار اور ہر طرف اوندھے منہ گری ہوئی عمارتوں کے ملبے تلے دبے معصوم لوگوں کے خواب وخیال دراصل نئے استعماری نظام کی نمائندہ عمارتوں کو تباہ کرنے کے بعد امریکی انتقامی کاروائیوں کا نمونہ تھا جس نے ہنستے بستے بغداد کو کھنڈرات میں بدل دیا۔اس بارے میں افسانے میں واضح موقف موجود ہے:"اب اس شہر میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے کہ کون کہاں ہو گا۔ہو سکتا ہے یہاں بغداد کی گلیوں میں گلی سڑی لاشوں کے نیچے مرے ہوئے کتوں کی طرح دبے پڑے ہوں۔ہشام بصرہ میں ہوتا تھا اور قاسم ایک بار ملا تھا۔کہتا تھا کہ وہ موصل میں ہے۔" حلیمہ !کچھ تو خدا کا خوف کرو۔تم اتنے پیارے اور معصوم انسانوں کو کتے کہہ رہی ہو۔"میری بات پر اس کو طیش آگیا تھا۔چلا کر کہنے لگی۔"خدا کا خوف میں کروں ہارون؟یا وہ جنہوں نے ہم کو کتوں سے بدتر بنا

دیا۔ جیتی جاگتی جانوں کو لاشوں کے ڈھیروں میں تبدیل کر دیا۔ اور اب غور فرمارہے ہیں کہ ان کو ٹھکانے کیسے لگایا جائے۔ تم ان کی تقریروں کے لہجے اور دبدبے تو نوٹ کرتے ہی ہو گے۔"(٦)

حلیمہ کے ہاں تلخیِ حیات سے پھوٹنے والے ان احساسات کو دکھایا گیا ہے جو خارجی عوامل کی دین ہے اور طاقتور ملک کی کمزور ملک پر جارحیت کی نمائندہ ہے۔ یہ تلخیِ حیات ریاستی دہشت گردی کا لگایا گیا ایسا زخم ہے جس کے درد کو سہہ سہہ کر انسان زندہ لاش بن جاتا ہے اور اسے زندہ رہنے یا مر جانے کی آرزو نہیں ہوتی۔ حلیمہ نے اپنی زندگی میں جس المیے کا سامنا کیا ہے اس کی وجہ سے وہ زندہ لاش بن چکی ہے اور اس کی زندگی مین ایسا جمود اور ٹھہراؤ آگیا ہے جو زندگی کو ساکت و جامد کر دیتا ہے۔ اس طرح کی یاسیت بھری نفسیات کی تشکیل اس وقت ہوتی ہے جب انسان کو اپنی طاقت سے بڑے المیوں کو سہنا پڑتا ہے۔ یہ صرف ایک حلیمہ کی المناک داستان نہیں ہے بلکہ عراق کے ہر گھر اور بغداد کی ہر شہر زاد کی دکھ بھری کہانی ہے اور افسانہ نگار نے اسی تناظر میں عراقی مسلمانوں پر قیامت امریکیوں نے برپا کی، اُسے بیان کیا ہے۔ پورا بغداد ویران ہے اور گھر بے نمبر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہارون الرشید جب حلیمہ سے پوچھتا ہے کہ وہ کہاں رہتی ہے تو حلیمہ زہر خند مسکراہٹ سے کہتی ہے کہ ٹوٹے ہوئے تباہ حال کھنڈروں کے نہ نمبر ہوا کرتے ہیں نہ نشان کیونکہ اب تو گلیاں اور سڑکیں بھی معدوم ہو چکی ہیں۔ حلیمہ کا خاوند اور بہت سی ہزاروں عراقی دلہنوں کے شوہروں کی طرح امریکی درندوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر شہید ہو گیا ہے اور بغداد کی اس نئی شہر زاد حلیمہ کو لٹے پٹے قافلوں میں چھوڑ گیا جو ہر لمحہ جیتی اور مرتی ہے۔ غرض یہ کہ الطاف فاطمہ نے گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد مشرقِ وسطیٰ میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے امریکی مظالم کو کرب انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ دیگر خواتین افسانہ نگاروں میں سے جنھوں نے ۹/۱۱ کے مابعد کو اپنے افسانوں میں موضوع بنایا، اُن میں نیلوفر اقبال کا نام بڑا معروف ہے۔ نیلوفر اقبال نے امریکہ کے کمزور مسلم ممالک سے بے رحم انتقام کی کہانیاں انتہائی سوز و گداز کی حامل فضا میں لکھی ہیں۔ نیلوفر اقبال کا "اوپریشن مائیس" ایک ایسا ہی افسانہ ہے جو عراق پر امریکی جارحیت کی داستان سناتا ہے۔ اس افسانے کا سربر آوردہ کردار جنرل مرسی ہے۔ جنرل مرسی اپنے نام کی طرح بہت ہی نرم دل ور حلیم الطبع انسان ہے۔ وہ انسانوں سے پیار کرنے والا شخص ہے لیکن دوسری طرف سیاست اور جنگ میں مضبوط اعصاب رکھنے والا شخص ہے۔ وہ پینٹا گون میں ہونے والے ایک اہم اجلاس میں شریک ہوتا ہے جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملوں سے متعلق بلایا گیا تھا۔ اس اجلاس کو امریکی ملٹری اور سیاست دان

طنزیہ طور پر "اوپریشن مائیس" کا عنوان دیتے ہیں۔ "اوپریشن مائیس" افسانہ نگار نے بڑے گہرے طنز کے لیے افسانے کے عنوان کے طور پر انتخاب کیا ہے کیونکہ اس عنوان سے امریکہ کے مسلمانوں کے خلاف ازلی تعصب اور نفرت و حقارت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ان عربوں یعنی عراقیوں کے خلاف امریکی اسٹیبلشمنٹ اور سیاستدانوں نے عوام میں یہ مشہور کیا کہ وہ امریکی مفادات اور امریکی قوم کے خلاف خوفناک عزائم رکھتے ہیں اور تیل کے بہت بڑے خزانے کے مالک ہیں۔ امریکیوں کی نظر عراق کے تیل کے کنوؤں پر ہے اور انھیں دہشت گردی سے کوئی سروکار نہیں ہے کیونکہ امریکہ دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد ہے، لہٰذا وہ دوسروں پر دہشت گردی کا لیبل لگا کر اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل چاہتا ہے۔ عراق کے اس تیل کے خزانے کو ہتھیانے کے لیے جنرل مرسی جیسے نرم دل اور "کسٹرڈ ہارٹ" شخص میں لالچ پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے اندر کی فرعونیت اور شقی القلبی ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ جنرل مرسی جو پہلے عراق پر حملے کے خلاف تھا۔ اب وہ پینٹا گون میں ہونے والی میٹنگ کے بعد عراق پر حملے کے حق میں ہو جاتا ہے۔ نیلوفر اقبال نے جنرل مرسی کی ذہنیت کا پردہ اس کی بیوی کے ساتھ گھر میں ہونے والی گفتگو میں چاک کیا ہے۔ اس معاملے میں جنرل مرسی اپنی بیوی کو اعتماد میں لیتا ہے اور اوپریشن مائیس یعنی عراق پر حملے کے لیے جواز گھڑتے ہوئے اپنی بیوی کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے: "دیکھو۔ میں تمھیں سمجھاتا ہوں۔" جنرل مرسی نے احتیاط اِدھر اُدھر دیکھا۔ حالانکہ ڈرائنگ روم میں اس کی بیوی اور خود اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ "دیکھو نا۔ میں ایک سادہ مثال دیتا ہوں۔ مثال کے طور پر ایک خزانے کو لے لو۔ مِتھ کے مطابق خزانے کی حفاظت کون کرتا ہے؟" "سانپ" مارتھا فوراََ بولی۔ "لیکن اگر خزانہ ہو بہت ہی بڑا بہت ہی بڑا خزانہ۔ دنیا کا سب سے بڑا خزانہ۔ تمھارے تصور سے بھی بڑا۔۔۔ اور اُس پر چوہوں کا قبضہ ہو۔ تو۔۔۔ تو؟" "اوپریشن مائیس۔ یس۔ اوپریشن مائیس۔" "کچھ بھی کہہ لو مرسی، لیکن جنگ ہے تو بہت ہی اَن سولائزڈ چیز اور وہ بھی اِن موڈرن زمانوں میں۔ یہ سب تو ہسٹری میں ہوتا تھا۔ پرانے زمانوں میں دوسرے ملکوں کو فتح کرنا۔ کیا پریزیڈنٹ لفظ "Invasion" استعمال نہیں کرتے؟ سوچو تو ذرا۔ پھر بھی"۔ "آج سے پانچ سو سال بعد یہ بھی ہسٹری ہو گی مارتھا۔ شاید تم نے وقت کے بارے میں اس انداز سے سوچا ہی نہیں۔ تمھارے لیے وقت شاید لمحہ ہی ہے۔ اور پھر مارتھا سویلائزیشن تو سویلائزڈ کے لیے ہوتی ہے۔ تم ان چوہوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ ان کے وجود کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔"(۷)

مقتدر اور زور آور طاقت انسان کو کرپٹ اور سفاک بنا دیتی ہے اور وہ دوسروں کی دولت کو ہتھیانے کے لیے بھونڈے جواز ڈھونڈتا ہے جنرل مرسی کی طرح اور بالکل اسی طرح ایک طاقتور ملک نے عراق کے ساتھ سلوک کیا۔ یوں جنرل مرسی جیسے رحم دل انسان میں امریکی انتقام اور عراقی عربوں کے لیے حقارت و نفرت کے جذبات کو دیکھ کر قاری بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ متشدد ذہنیت رکھنے والے امریکیوں کی انتقام اور ہوسِ زر کی کیا حالت ہو گی۔ جنرل مرسی ایسا شخص جو اپنی پالتو کتیا کی موت پر بے حد رنجیدہ ہوتا ہے اور اس کا دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے، وہ عراق کے مسلمانوں پر حملے کے معاملے میں تمام جذبات سے عاری ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکیوں کو طمع، مفاد پرستی اور خود غرضی نے شروع سے ہی بے حد سفاک اور ناانصاف بنایا ہے۔ اس افسانے میں تیسرا کردار چوہوں یعنی عراقی عربوں کا ہے جنھیں امریکی حقارت سے چوہے یعنی مائیس کہتے ہیں۔ یہ عراقی عرب معدنی تیل کے لامتناہی خزانے کے مالک ہیں جبکہ جنرل مرسی تیل کے ان ذخائر پر قبضہ کر کے تیل کو امریکہ منتقل کرتے ہوئے یہاں کے انفراسٹرکچر کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔ نیلوفر اقبال کا ایک اور افسانہ "سرخ دھبے "(اوپریشن مائیس II) ہے جو ان کے پہلے افسانے "اوپریشن مائیس" کی اگلی کڑی ہے۔ یہ پچھلے افسانے کا اگلا پڑاؤ ہے جس میں دو امریکی نوجوان فوجی ٹونی ڈکسن اور جیمز کے درمیان مکالمے کی صورت میں امریکہ کی عراق جنگ کا تجزیہ اور وہاں پر ہونے والی تباہی و بربادی کو پیش کیا گیا ہے۔ ٹونی ڈکسن افسانے کے آخر میں عرب ڈاکوؤں کے ہاتھوں کتے کی موت مارا جاتا ہے جبکہ جیمز امریکی فوجی ہونے کے باوجود ایک غیر جانبدار تجزیہ کار ہے جو یہ امر بخوبی جانتا ہے کہ امریکہ کی عراق پر خونی یلغار اور تیل کے ذرائع کی لوٹ مار انسانیت کے خلاف سنگین دہشت گردی ہے مگر بادلِ نخواستہ بغداد میں وہ نگراں فوج کی ڈیوٹی دیتا رہتا ہے۔ جیمز ایک باضمیر کردار ہے اور جانتا ہے کہ امریکہ عراق کے معصوم لوگوں پر ظلم کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیمز کا ضمیر معصوم اسے انسانیت سوز مظالم کا مرتکب ہونے پر اس کے دل پر کچوکے لگاتا ہے۔ جیمز امریکی فوج کی غلط پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے جبکہ ٹونی عراقیوں کا تیل لوٹنے پر خوشی مناتا ہے۔ دونوں کو اس بات کا ادراک ہے کہ عراقی ان سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ جیمز ٹونی کے برعکس حالات کا مارا ہوا مجبور فوجی ہے جو عراقی جنگ میں امریکی جارحیت پر کڑی تنقید کرتا ہے جبکہ ٹونی اس کو متعجب نگاہوں سے دیکھتا ہے: "میں! ہم نے ایک پورا ملک فتح کر لیا ہے۔ اور وہ بھی ذرا سی کوشش سے۔۔۔ اور کون سا ملک؟ An Oil rich Counrty۔۔۔ ہم اس کے مالک ہیں اب۔۔۔ امریکہ کا کتنا بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ Joblessness

ختم۔۔۔کام ملے گا۔۔کنٹریکٹ ملیں گے۔۔ تیل کی ساری دولت ہماری۔۔Wohee! تم پتا نہیں کس بات پر بسور رہے ہو۔ جیمز جانتا تھا کہ ٹونی کے خیالات وہی تھے جو زیادہ تر دوسرے لوگوں کے تھے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولا، لیکن کس قیمت پر ہمارا اقدام دنیا بھر میں Aggression سمجھا جارہا ہے۔بلئیر پر بھی لندن میں مصیبت آئی ہوئی ہے۔ یہ لوگ جنھیں آج ہم Terrorist کہہ رہے ہیں۔ جلدی ان کے لوگ انہیں فریڈم فائٹرز کہنے لگیں گے اور قابلِ نفرت قابض طاقت۔۔Occupiers۔۔ ہم نے ان کی پر سکون روز مرہ زندگی تباہ کی۔ میں اس دن اپنے آپ سے شرم سار تھا۔ میرا دل دکھا تھا جب بغداد کا میوزیم اور نیشنل لائبریری برباد کی گئی۔ اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ یہ غیر انسانی کام تھاٹونی!"(۸)

آج سے آٹھ سو سال قبل جس طرح سے منگول وحشیوں نے بغداد کو جلا کر راکھ کیا اور یہاں کا بیت الحکمت جلاڈالا تھا۔ ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم کیا تھا یہاں تک کہ فرات مسلمانوں کے خون سے رنگین ہو کر بہتا رہا تھا۔ بالکل اسی طرح سے امریکیوں نے تیل کے ذخائر ہتھیانے کے لیے اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں منگولوں کی وحشت و بربریت کی یاد تازہ کر دی۔ امریکیوں کی بمباری کا نشانہ جو عراقی مسلمان بن رہے تھے وہ کسی داستان کے کردار نہیں تھے بلکہ جیتے جاگتے انسان تھے۔ جیمز ایسے میں اپنے آپ پر کڑھتا ہے کہ وہ محاذِ جنگ پر امریکی فوج کے جھوٹے دعووں کے جھانسے میں آکر کیوں کر آ گیا۔ اسے معلوم ہو چکا ہے کہ پینٹا گون نے ان لوگوں کو جس مشن پر عراق بھیجا ہے وہ انسانیت دوست نہیں بلکہ انسانیت کش اور نئ استعماریت کی لوٹ مار کے منصوبے کی تکمیل کا سلسلہ ہے۔ جیمز کی روح اور اس کا ضمیر اپنے کیے گئے جرائم پر شرمندہ ہے۔ جیمز کی طرح کی ذہنیت رکھنے والے Contour Characters در اصل امریکیوں کے ایسے طبقے کی نمائندگی کرنے کے لیے افسانہ نگار نے تخلیق کیے ہیں جو امریکہ کی عراق اور افغانستان جنگ کے ہمیشہ سے مخالف رہے ہیں اور صدائے احتجاج بلند کرتے رہے ہیں لیکن امریکی حکومت ان کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار نے جیمز کے خیالات کو بار بار افسانے میں بیان کیا ہے جو امریکی فوج کی عراق پر شب خون کو ناانصافی سے تعبیر کرتے ہیں اور خود اپنے ملوث ہونے پر شرمندہ ہوتے ہیں: "ٹونی جیمز کے چہرے کے اتار چڑھاؤ غور سے دیکھ رہا تھا۔ مسکرا کر کہنے لگا۔ کیا سوچ رہے ہو بڈی؟" سوچ رہا ہوں ہم ہزاروں میل دور سے انھیں شاید مسلم ہونے کی سزا دینے آئے ہیں۔ ان پر اٹیک کرنے والے Crusaders ہم خود ہیں۔۔۔Liberation my foot!۔"(۹)

اس افسانے میں ایک اور منظر ٹیلی ویژن کی سکرین پر دکھایا جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن سکرین پر بیان کیے منظر میں افسانہ نگار نے Visual Effects کو باکمال انداز میں افسانے کے پلاٹ میں تشکیل دیا ہے۔ عراقی فلوجہ کے قریب فوجی گاڑیوں کو آگ لگاتے ہیں اور جلتی ہوئی لاشوں کو گھسیٹ کر سڑک پر نکالتے ہیں۔ پھر ان لاشوں پر ڈنڈے برساتے ہیں۔ ایک جلی ہوئی لاش کو گاڑی سے باندھ کر دور تک گھسیٹتے ہیں۔ یہ لاش جو سرخ دھبے والی تھی اور جو گوشت کے لوتھڑے میں بدل چکی تھی، ٹونی کی لاش تھی۔ اس منظر کے بعد جیمز کی خود کلامی اور مناظری جزئیات ہجوم کے انتقامی اقدامات کو ظاہر کرتے ہیں اور ٹونی کی عبرتناک موت پر جیمز نوحہ خوانی کرتے ہوئے اپنے اعلیٰ حکام کو کوستے ہی رہ جاتا ہے: "وہ مارا گیا کیونکہ ہم Intolerant ہیں۔ ہم سے کسی کے Creeds برداشت نہیں ہوتے۔ ہم ظالم ہیں۔ ہم بے حس ہیں۔ ہم Terrorist ہیں۔ ہم خود ہیں Damned Crusaders ---Fucking Fundamentalists اسی لیے ٹونی مارا گیا۔ صرف اکیس سال کا۔۔ وہ مارا گیا۔ کیونکہ ہم آئے تھے ہزاروں میل دور سے ہزاروں ٹن بم لے کر اس ستائے ہوئے ملک کو برباد کرنے Damned Fucking Liberators۔۔ اسی لیے مارا گیا ٹونی۔ پال بریمر، تم خود ہو انسانی گیدڑ۔۔۔ یو شِٹ (You Shit)۔"(۱۰)

اس افسانے میں امریکہ کے مسلمانوں کے خلاف تعصب کو ظاہر کرتا ہے اور امریکی کرداروں کی زبان سے اپنے آپ کو لٹیرا اور عالمی دہشت گرد کہلوایا گیا ہے جو کہ عین حقیقت ہے۔ دوسرا یہ کہ کہانی کے آخر پر ٹیلی ویژن اسکرین کے جس منظر کو پیش کیا گیا ہے وہ عراقی ہجوم کا وحشت ناک ردِ عمل ظاہر کرتا ہے اور ظالم امریکی فوجیوں کے لیے مکافاتِ عمل ہے۔ ان دونوں افسانوں "اوپریشن مائیس ون اور ٹو" میں مارتھا کی آخری گفتگو اور ریگستان میں امریکی فوجی کی گمنام موت اور دوسرے افسانے میں جلے ہوئے گوشت کی بو ایک ربط پیدا کرتے ہیں جو کہ گہری معنیات کا حامل ربط ہے۔ دیگر خواتین افسانہ نگاروں میں زاہدہ حنا دہشت گردی اور مذہبی تعصب جیسے مسائل پر لکھنے والی عصرِ حاضر کی معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کا افسانہ "کُم کُم آرام سے ہے" امریکہ افغان جنگ کا موضوع لیے ہوئے ہے اور افغانستان کے نہتے مسلمانوں پر امریکی جارحیت، وحشت و بربریت اور تباہی و بربادی کی داستان سناتا ہے۔ افسانے میں 'کُم کُم' ایک مرکزی کردار ہے اور اس کی خط و کتابت اپنی دادی ماں سے ہوتی ہے۔ وہ اپنے خطوں میں افغانستان پر امریکی مظالم کا خونچکاں احوال لکھ بھیجتی ہے۔ "کُم کُم" اور ٹیگور کے افسانے "کابلی والا" کی ننھی میں کافی حد تک مماثلت موجود ہے۔ کُم کُم ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کے ساتھ رضاکار بن کر قندھار میں

موجود ہے اور زخمیوں کی دیکھ بھال کے لیے ڈاکٹروں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ وہ روز انسانی جسموں کے چیتھڑے دیکھتی ہے اور انسانیت سوز امریکی مظالم کا احوال اپنی دادی کو لکھ بھیجتی ہے:"چنگیز خان اور اس جیسے دوسرے بادشاہوں، راجوں مہاراجوں کا غصہ ان شہروں پر اترتا جو ان کے راستے میں آتے تھے اور ان کی فوجوں کے خلاف ہتھیار اٹھاتے لیکن دادی اماں امریکہ کا غصہ تو قندھار سے قندوز، دھرتی میں بارودی سرنگیں یوں بوئی گئی ہیں جیسے کھیت میں بیج چھڑکے گئے ہوں۔ موت کے بیج، بچے، بوڑھے مرد اور عورتیں سب ہی ان کا نوالہ بنتے رہتے ہیں۔ جن کے ٹکڑے اڑ گئے، لوگ انہیں خوش نصیب سمجھتے ہیں۔ ورنہ کسی کا ایک ہاتھ نہیں اور کوئی دونوں ہاتھ کھو بیٹھا ہے۔ کسی کی ٹانگیں نہیں رہیں۔ میں نے وہ بھی دیکھے جن کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر غائب ہیں۔"(۱۱)

امریکہ کا جنگی جنون اس حد تک اس کے سر چڑھا کہ اس نے طالبان کو دبانے کے لیے لاکھوں لوگوں کو بموں سے اڑادیا اور لاکھوں مکانات تباہ کر دیئے۔ لیکن طالبان کھنڈرات میں زندگی بسر کرکے بھی امریکی فوجوں سے مقابلے کرتے رہے اور انھیں ناکوں چنے چبوائے۔ طالبان کے انتقام کا نشانہ جہاں امریکی بنے وہاں پاکستانیوں کو بھی امریکہ افغان جنگ کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ ماضی میں حکومتوں کے گٹھ جوڑ کے رویوں نے ایسی کسی دہشت گرد تنظیم کو جنم نہیں دیا تھا جس طرح مشرف دور میں پاکستان کی امریکی اتحاد میں شمولیت نے دہشت گردوں کو ہوا دی اور انہوں نے اندرونِ ملک بھی امن کی صورتِ حال کو تباہ کیا۔ طالبان کا واحد مقصد امریکیوں سے انتقام لیناہے۔ گُم گُم آگے کیا لکھتی ہے، ملاحظہ کیجیے:" دنیا طالبان کو برا بھلا کہتی ہے۔ میں یہاں آئی تو ان کے لیے میرے دل میں غصہ اور نفرت تھی لیکن یہاں رہ کر وہ میری سمجھ میں آئے۔ کسی غریب اور بنجر مُلک کے بچوں سے جب ان کا بچپن چھن جائے جنہیں بڑی بہنوں نے انگلی تھام کر سہج سہج چلایا نہ ہو، ان سے آنکھ مچولی نہ کھیلی ہو، پھر وہاں طالبان ہی اٹھتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں عورتوں کے نام سے۔۔۔ ان دنوں میں جہاں جی رہی ہوں وہ امریکہ کا وار تھیٹر ہے۔ چنگیز خان کا لشکر بامیان کا زن بچہ کو لہو پلوا کر آگے بڑھ گیا تھا لیکن آج کے چنگیز کہیں نہیں جاتے، وہ ڈریکولا کی طرح قوموں کی گردن میں اپنے دانت اتار دیتے ہیں اور خون چوستے رہتے ہیں۔ اپنے ہوائی جہازوں سے موت اور مکھن کی ٹکیاں بسکٹ کے پیکٹ اور بارودی سرنگیں ایک ساتھ پھینکتے ہیں۔"(۱۲)

زاہدہ حنا کا یہ افسانہ ڈبل پلاٹ کا حامل ہے۔ افسانے کا لوکیل افغانستان ہے جو بارود کی سرزمین ہے اور جگہ جگہ پر امریکیوں نے لینڈ مائنز بچھا رکھی ہیں۔ افسانے میں قابلی والا حشمت خان اور افغانستان دونوں اسی امریکی بارود سے

متاثر ہیں۔ کچھ اسی طرح کی صورتِ حال زاہدہ حنا کے افسانے "نیند کا زرد لباس" میں بیان کی گئی ہے کہانی کی ہے جو افغانستان میں امریکی حملے سے بھاگ کر جان بچانے والے افغانی مہاجرین کی المناک کہانی ہے۔ ان لٹے پٹے افغان مہاجرین نے سوویت یونین کے افغانستان پر حملے اور بعد ازاں امریکی حملے کے دوران پاکستان ہی کو جائے پناہ منتخب کیا تھا۔ امریکی وحشت و بربریت سے متاثرہ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک پروین نامی لڑکی کا ہے۔ پروین کی کہانی خط کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہے کیونکہ افسانہ نگار نے اس کہانی کے پلاٹ کو خط کی تکنیک کے ذریعے سے آگے بڑھایا ہے۔ پروین امریکی صدر کو لکھتی ہے اور خط میں یہ سوال اٹھاتی ہے کہ اُن افغان بچوں کا کیا قصور ہے جنہیں بموں، گولیوں اور بھوک سے دن رات مارا جارہا ہے؟۔ افسانہ نگار نے دل سوز اسلوب میں پروین کے خطوط کے ذریعے سے اس کی کہانی بتلائی ہے۔ پروین کا کردار حقیقت کے عین مطابق تراشا گیا ہے جو پر امریکہ کی ریاستی دہشت گردی کا پردہ چاک کرتا ہے: "میرا نام پروین ہے جناب! میں دس برس کی تھی جب آپ نے مجھے کابل سے نکال دیا۔ ہم وہاں سے نکلتے نہیں تو اور کیا کرتے؟ بم آپ کے بنائے ہوئے تھے۔ بمبار آپ کے بھیجے ہوئے تھے اور ہمارے گھر اڑ رہے تھے۔۔ آپ کے بھیجے ہوئے جہاز جب ہمارے لیے بسکٹ کے پیکٹ، مکھن کی ٹکیاں اا ور رنگ برنگ کی تتلیاں گرا رہے تھے تو میں اور میری کئی سہیلیاں ان تتلیوں کو اٹھانے کے لیے بھاگیں۔ بسکٹ کے پیکٹ اور مکھن کی ٹکیاں اٹھانے والے بچ گئے۔ تتلیاں پکڑنے والی میری دو سہیلیوں کو تتلیاں اپنے ساتھ لے گئیں اور میری ایک ہتھیلی بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔"(۱۳)

افسانہ نگار نے بڑی فن کاری کے ساتھ پروین کے کردار کے ذریعے سے وہ تاریخی حقائق کہلوائے ہیں جو شاید وقت کا مورخ کبھی نہیں لکھ سکے گا۔ افغانیوں کو طالبان کی آڑ میں کیوں مارا جا رہا ہے؟ معصوم لوگوں کا کیا قصور ہے؟ پروین کے اس سیدھے سوال کا جواب امریکی صدر کے پاس بھی نہیں۔ خط میں پروین آگے مزید لکھتی ہے: "عالی جناب! میرا رشتے کا ایک بھائی خوب گانے سنتا تھا، فلمیں دیکھتا تھا۔ کہتا تھا بالی وڈ جا کر ہیرو بنوں گا۔ پھر آپ کے فوجیوں نے اتنے بم برسائے۔ اتنے بچوں اور عورتوں کو ناحق مارا، مدرسے اور مسجدیں مسمار کیں کہ وہ خود کش بمبار بن گیا۔ اس کے سر کی تصویر اخبار میں چھپی۔ قسم ہے خدا کی! وہ تو بہت ہنستا کھیلتا فلمی سٹائل نوجوان تھا۔ عالی جناب! اس کو خود کش بمبار آپ نے بنایا۔"(۱۴)

خلاصہ بحث:

اس افسانے کی طرح زاہدہ حنا کا ایک اور موثر افسانہ "رقصِ مقابر" کے عنوان سے ہے جس میں زاہدہ حنا نے اس قدر سچ لکھ دیا ہے کہ پاکستان کے کسی بھی رسالے یا جریدے کو ہضم نہ ہو سکا اور انہوں نے سچ گوئی کے تمام تر فرضی دعووں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے "رقصِ مقابر" کو شائع کرنے کی جرأت نہیں کی۔ بالآخر یہ افسانہ ہندوستان میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ افسانہ افغانستان کی خونچکاں تاریخ کو اپنے اندر اس طرح سے سموئے ہوئے ہے کہ اس کے لفظ لفظ سے خون رِس رہا ہے۔ افسانے میں کابل میں پر سکون علمی و ادبی اور تہذیبی زندگی کو جہنم میں تبدیل ہوتے دکھایا گیا ہے۔ طالبان پر امن طریقے سے حکومت کر رہے تھے اور اسلام کا پرچم بلند کر رہے تھے۔ امریکہ سے چونکہ دوسرے لوگوں کا مذہب برداشت نہیں ہوتا، لہٰذا یہ آج کا نیا صلیبی فتنہ ہے جو اپنی فطری فتنہ پروری کے باعث کمزور اسلامی ممالک پر یلغار کر دیتا ہے۔ اس افسانے میں زاہدہ حنا نے تاریخِ آدم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ افغانستان ابوالبشر حضرت آدمؑ کے قاتل بیٹے قابیل کی بسائی ہوئی سرزمین ہے، لہٰذا یہ سرزمین لہو کی پیاسی ازل سے ہے اور یہاں جنگیں اور قتل و غارت قبل از تاریخ سے جاری ہے جو تھمنے کا نام نہیں لے رہیں۔ یہ سرزمین ہے کہ اس کی لہو کی پیاس بجھنے میں نہیں آتی اور ہر دور میں خون کا بیاج طلب کرتی ہے۔ مجموعی طور پر ہم یہ نتائج اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اکیسویں صدی کی پاکستانی خواتین افسانہ نگاروں نے زندگی کے دوسرے مسائل کی طرح دہشت گردی اور مذہبی منافرت اور رسوم و رواج کی بنیاد پر روا رکھے جانے والے تعصبات اور ان تعصبات کی انتہائی عملی شکلوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنانے میں کسی بھی طرح کے بُخل سے کام نہیں لیا۔ ان کے افسانوں میں عصری آشوب اور معاشرے کی اصل تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مصادر و مراجع

۱۔ نجیبہ عارف: "11/9 اور پاکستانی اردو افسانہ"، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۲۲

۲۔ ایضاً ، ص ۵۲

۳۔ الطاف فامہ: "دید وادید" مشمولہ 11/9 اور پاکستانی اردو افسانہ، مرتب نجیبہ عارف، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۵۱

۴۔ ایضاً ، ص۵۲

۵۔ ایضاً ، ص۵۴

۶۔ ایضاً ، ص۵۶

۷۔ نیلوفر اقبال: "اوپریشن مائس" مشمولہ 9/11 اور پاکستانی اردو افسانہ، مرتب نجیبہ عارف، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص۱۲۳

۸۔ ایضاً ، ص۱۳۱

۹۔ ایضاً ، ص۱۳۳

۱۰۔ ایضاً ، ص۱۳۷

۱۱۔ زاہدہ حنا: "کم کم آرام سے ہے" مشمولہ: رقصِ بسمل (الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۱۰۲ء) ص۱۵۴۔۱۵۵

۱۲۔ ایضاً ، ص۱۵۶

۱۳۔ زاہدہ حنا: نیند کا زرد لباس" مشمولہ رقصِ بسمل (الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء) ص۱۳۳

۱۴۔ ایضاً ، ص۲۱۵

1- Najeeba Arif, "9/11 and Pakistani Urdu Afsaana", Porab Academy, Islamabad, 2011, p22
2- Ibid, p52
3- Altaf Fatima, "Deed wa Deed", Mashmullah 9/11 and Pakistani Urdu Afsana edited Najeeba Arif, Porab Academy, Islamabad, 2011, p51
4- Ibid, p52
5- Ibid, p54
6- Ibid, p56
7- Nilofar Iqbal; "Operation Mice", Mashmullah 9/11 and Pakistani Urdu Afsana, edited Nakeeba Arif, Porab Academy, Islamabad, 2011, p123
8- Ibid, p131
9- Ibid, p133
10- Ibid, p137
11- Zahida Hina; "Kam Kam Araam Se Hai", Mashmullah, Raqse Bismil, Al Hamd Publications, Lahore, 2011, p154-155
12- Ibid, p156
13- Zahida Hina; "Neend Ka Zard Libaas", Mashmullah; Raqse Bismil, Al Hamd Publications, Lahore, 2011, p133
14- Ibid, p215